نظریۂ حیات کی تشکیلِ نو

اسلم صدیقی۔ ترجمہ محمد سرور

(آخری قسط)

روایت پرستی اس کے برعکس مسلمانوں نے اپنے اندر پیچھے کی طرف دیکھنے کی خاصیت بہت زیادہ پیدا کرلی ہے۔ اس نے اُنہیں آگے دیکھنے سے قریب قریب محروم کر دیا ہے اور ان میں موجودہ حقائق کو ادراک کرنے کی صلاحیت کم ہو گئی ہے۔ بے شک روایت اچھی چیز ہے لیکن روایت پرستی اچھی نہیں۔ روایت پرستی بڑی آسانی سے رجعت پسندی کا موجب بن جاتی ہے۔ ماضی کی اس خیال سے جستجو کرنا کہ بعینہٖ اُسی کے مطابق حال کو منظم کیا جائے۔ روایت کی حقیقی عزت نہیں بلکہ یہ صحیح طور پر عقل مندی بھی نہیں۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ بعض مخصوص قواعد وضوابط، عقائد اور معیاری نمونوں کو اس بنا پر اختیار کلّی کا درجہ دے دیا جائے کہ وہ ماضی سے تعلق رکھتے ہیں، نہ اس لئے کہ آج وہ مفید ہیں! اسلام کی روح اس کے خلاف ہے۔ مسلمانوں کو کبھی بھی اس طرح "ماضی" کو پوجنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ فی الحقیقت یہ تو کافروں کی امتیازی خصوصیت تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: "واذ قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما وجدنا علیہ اباءنا" ۲: ۱۷۰۔ (جب ان سے کہا گیا کہ اللہ نے جو اتارا ہے، اس کی پیروی کرو تو انھوں نے کہا کہ ہم تو اس کی پیروی کرتے ہیں، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔)

مسلمانوں کو اب خود اپنے لئے سوچنا اور ماضی سے سبق لینا ہوگا۔ ایک مخصوص اندازِ فکر اور طریقہ کار کے پیچھے کیا محرکات ہیں۔ ان کا انہیں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ماضی کی افادیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے غور وفکر اور عمومی طرزِ عمل کی عادت ڈالی جائے۔ ماضی کام کرنے کے ایک طریقے کی مثال پیش کرتی ہے۔ ماضی کی افادیت یہ نہیں کہ وہ عمل کی مخصوص حرکات کو مشین کی طرح دوبارہ بروئے کار لانے کی عادت کی تلقین کرے۔ پہلا طریقہ کار تخلیقی اور زندگی بخش ہے اور دوسرا یقینی طور پر خودکشی ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں صنعتی معیشت اور سائنسی ایجادات کے مفید نتائج سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے۔ اسلام کو صنعتی انقلاب کا فلسفہ اپنے اندر سمونا ہوگا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے اور ذرائع اختیار کرنا ہوں گے۔ دولت مُردار نہیں

کہ صرف کتے ہی اس کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، جس کے لئے انسان کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

مشہور مصنف خدا بخش کے نزدیک مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمان عوام اور ان کی حکومت کے مادی حالات کے درمیان باہم ایک گہرا تعلق تھا۔ اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں:۔ "مسلمانوں کی تہذیب کا اعلیٰ درجے پر پہنچنا بنیادی طور پر ساز گار معاشرتی اور اقتصادی حالات کی بنا پر تھا۔" [۱۸] تقدیر پرستی، محتاجی و مصیبت پر تسلیم و رضا اور ترکِ دنیا کا عمومی طرزِ عمل۔ یہ چیزیں پہلی صدی ہجری میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں، ان کو بند کرانے کے لئے وقتی طور پر مفید تھیں۔ اب تو یہ عقیدے اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔

اس طرح کے فکری رجحانات قطعاً اسلام کی خصوصیات میں سے نہیں ہیں، بلکہ ان سے تو اسے بیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور قدرتی وسائل سے کام لیا جائے۔ موجودہ حالات میں غریب ہونا ایک گناہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "کاد الفقر ان یکون کفراً۔" (فقر کفر کے قریب قریب ہو جاتا ہے)۔ اس طرح مسلمان مسلم معاشرے کا سہارا بننے کے بجائے اس پر ایک بوجھ بن جاتے ہیں۔ وہ اسلام کو سنگین قسم کے خطرات کا جو معاشی پیداوار کی ناہمواری سے پیدا ہوتے ہیں، نشانہ بنا دیتے ہیں۔ صبر و رضا کا فلسفہ خودکشی کے مترادف ہے۔ اسلام سے وفاداری کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کی جائے تاکہ خوش حال اسلامی معاشرے کی عظیم عمارت کی تعمیر کے لئے ایک مضبوط معاشی بنیاد فراہم کی جاسکے۔ تسلیم و رضا اور ترکِ دنیا کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ اس طرح کے ذہنی رویّے کو ہمیں بدلنا ہوگا۔

فرسودہ طرز ہائے فکر وہ معاشرتی قدریں اور طرز ہائے فکر و عمل جو پہلے سے چلے آتے ہوں اور اس وجہ سے مقدس مانے جاتے ہوں، معاشرتی و اقتصادی ترقی میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ ایک مختلف معاشرتی و اقتصادی [illegible] ارتقاء پذیر ہوئے تھے۔ ان میں معروضیت نہیں رہتی اور اس طرح جدید معاشرے میں قدروں میں جو باہمی کشمکش ہوتی ہے، وہ اسے شناخت کرنے اور حل کرنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس قسم کی معاشرتی قدریں کس حد تک نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ انھوں نے کس حد تک رسم و رواج اور اداروں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مسلمانوں میں یہ مذہبی مراسم اور ادارے ہی تھے جنہیں زمانے کے گزرنے یا ماحول کی تبدیلی سے پیدا ہونے والے تضادات کو جذب کرنا پڑا۔ تاریخ کے ایک طویل عہد میں مختلف عوامل نے انہیں جیسا چاہا، ڈھال دیا۔ یقیناً اب وہ بہت زیادہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔

---

[۱۸] CALIPHATE ص ۹۴

مسلمان دینوی اداروں کی تشکیل کے معاملے میں بہت زیادہ کمزور رہے ہیں۔ اسی لئے اُن کے ہاں ایسی معاشرتی روکیں نہیں، جو ٹھکرٹوں کو سہاریں۔ چنانچہ مسلمانوں نے دینوی اداروں کو مذہبی حیثیت دے کر اپنے لئے بعض سنگین قسم کے تضادات پیدا کر لئے ہیں، مثبت علم کے بارے میں ان کا جو رویّہ ہے، وہ اس کی ایک مثال ہے۔ یہ رویہ ناگزیر طور پر اس امر کا باعث بنتا ہے کہ حالات و واقعات کی دنیا سے پیدا ہونے والے سوالات سے آنکھیں موندلی جائیں اور ان کا خاطر خواہ جواب نہ دیا جائے۔ علاوہ ازیں آج اس حقیقت کا بھی کم ہی اعتراف ہوتا ہے کہ معاشرتی گناہ انفرادی گناہوں سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ مثال کے طور پر متعلقہ افراد رشوت ستانی اور بدعنوانی کو اُمت کے مفادات سے غداری کے بجائے چالاکی سمجھتے ہیں۔ معاشرتی خرابیاں معاشرے سے وفاداری پیدا کرنے اور معاشرتی اداروں سے ٹھیک طرح کام لینے سے ہی دُور کی جا سکتی ہیں۔

مسلمانوں کو ماہرین آثار قدیمہ کی طرح تاریخ کے ملبے میں سے روایت پرستی اور تحریف کے عناصر کو پہچاننا اور ان سے خلاصی حاصل کرنا ہوگا۔ اس طریقے سے وہ موجودہ دور کے سیاق و سباق میں اسلام کی حقیقی حدود اور اس کے مشمولات کو معیّن کرنے کے قابل ہوں گے۔ اس کے لئے تخلیقی انداز اور آزادی سے سوچنے کی ہمت اور جراءت کی ضرورت ہے۔ مشہور جرمن شاعر گوئٹے کہتا ہے: "جو تمہارا باپ تمہارے لئے ورثے میں چھوڑ گیا ہے، اگر تم واقعتاً اُسے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہو تو اسے نئے سرے سے حاصل کرو۔"

سیاسیات کی تنظیم چھاپہ مار لڑائی کے لئے ضروری ہے کہ نظریۂ حیات کو سب سے مقدم رکھا جائے، لیکن اس میں سیاسی خطرات بھی مضمر ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک نظریۂ حیات پر زور دیتے ہیں تو اس سے مختلف نظریہ حیات رکھنے والی اقلیتیں پیدا ہوں گی اور وہ معدے میں پتھر بن سکتی ہیں۔ بڑی بڑی طاقتیں تو ان کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہیں، لیکن عام طور سے ایسی مخصوص اقلیتوں کو ہضم کرنا جن کی اپنی خصوصیات ہوں، بڑا مشکل ہے۔ باوجود اس کے کہ ترکوں نے اپنے ہاں کی اقلیتوں کا بڑا خیال رکھا، لیکن اس معاملے میں ان کا تجربہ کوئی زیادہ خوشگوار نہیں رہا۔ عربوں نے تو اپنی مذہبی اقلیتوں کا مسئلہ یوں حل کر لیا کہ مذہب کو قومیت کی نذر کر دیا، لیکن یہ قیمت بہت بڑی ہے۔ اس طرح گویا انھوں نے مذہبی اقلیتوں کو نسلی اقلیتوں میں بدل دیا ہے، جو شائد قابل اعتماد ثابت نہ ہوں۔ غیر ملکی طاقتیں ان کو اپنے "ففتھ کالم" کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کی راہیں نکالی جائیں۔ کیونکہ چھاپہ مار لڑائی میں علاقہ اتنا اہم نہیں ہوتا جتنے کہ لوگ۔ نعلی وفاداریاں رکھنے والی اقلیتیں اس لڑائی میں سخت رکاوٹیں پیدا کر سکتی ہیں۔ وہ اس کا رخ موڑ سکتی بلکہ اسے ناکام بنا سکتی ہیں۔

مذہبی اقلیتیں اس ضرورت کے ماتحت نظریۂ حیات بنیادی طور پر اتنا وسیع ہونا چاہیئے کہ وہ داخلی اور خارجی ہر دو لحاظ سے اقلیتوں کو ساتھ ملا سکے اور ان کی حمایت حاصل کر سکے۔ اسلام کے دورِ اوّل کی پُرانی آزاد خیالی واپس آنی چاہیئے۔ اس طرح اُمت کا تصوّر غیر مسلموں کو بھی اپنے اندر لے سکتا ہے۔ ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں جو دستور بنا تھا، اس میں "قریش اور یثرب کے مومنین، ان کے متبعین اور جو اُن سے متعلق تھے" ان سب کو ایک امّت قرار دیا گیا تھا، جو دوسروں سے ممتاز تھی۔ اس مدنی دستور کی دفعہ ۲۵ میں ہے۔ "بنو عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ اُمت میں شریک ہیں۔ یہودیوں کا دین ان کے لئے ہے اور مسلمانوں کا دین مسلمانوں کے لئے۔ اس کا اطلاق اسی طرح ان کے حلیفوں پر ہوگا، جیسے خود اُن پر۔" علاوہ ازیں اُمت میں شرکت کے لئے ایک خاص جگہ کا ہونا بھی ایک بنیاد ہوتا تھا، جیسا کہ راتج قبیلے کے معاملے میں ہوا۔

پاکستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا شمار اسی زمرے میں ہوتا ہے، اس لئے یہ ایک ہی اُمت کے حصے ہیں اور قومی تحفظ کا شیرازہ انہیں باہم متحد کرتا ہے۔ ان سب کو پاکستان سے وفاداری کا حلف لینا ہوگا۔

بدقسمتی سے یہودیوں نے رسول اکرم علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے اپنے کئے ہوئے معاہدے توڑے اور بار بار آپؐ کو دھوکا دیا۔ بعد ازاں مسلمان فاتح بن گئے اور اس کے نتیجے میں صورتحال بدل گئی۔ یہ عوامل تھے جو بعد میں امت کے تصوّر کو محدود کرنے کا باعث بنے، موجودہ پاکستان میں حالات بالکل مختلف ہیں۔ غیر مسلم مسلح افواج میں بھرتی ہوتے اور ملک کے دفاع کی ذمہ داری میں شرکت کرتے ہیں۔

اس نہایت اہم فرق پر پوری طرح زور دینے کی ضرورت ہے۔ سنت نبوی کے مطابق مذہبی اقلیتوں کے ساتھ ایک ہی امت کے افراد ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی طرح قانونی لحاظ سے مساوی سلوک ہونا چاہیئے۔ اُمت کے تصوّر کی اس طرح کی تشکیل مذہبی اقلیتوں کے مسئلے کو حل کر سکتی اور یوں قومی تحفظ میں بہت حد تک ممد و معاون ہو سکتی ہے۔

فرد کی حفاظت وہ معاشرے جن کی بنیاد بلا شرکت غیرے صرف نظریۂ حیات ہوتی ہے، ان میں آمرانہ بن جانے کا رجحان ہوتا ہے۔ عہد حاضر میں انسانی حقوق اور انفرادی آزادیوں پر زور دیا جاتا ہے اور اس کا آمریت کے ساتھ گزارہ کرنا مشکل ہے۔ آمریت انفرادی غور و فکر میں رکاوٹ بنتی ہے، بلکہ وہ اس سے منع کرتی ہے اور اس طرح لوگوں کی تخلیقی صلاحیتوں پر پابندیاں لگا کر خود کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ان خطرات سے بچنے کے لئے قانونی نظام کی نظر ثانی ہونی چاہیئے۔ اسلام میں فرد کی حفاظت کرنا قانون کا کام ہے جسے اب موجودہ حالات کے مطابق کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں راسخ العقیدہ سنی مسلک کے بجائے مرجئہ مسلک کی تجدید کی ضرورت ہے، یعنی جُرم کی جو سزا مقرر ہے، اُس کو دینے

کے بعد ملّت افراد کا معاملہ خدا پر چھوڑ دے کہ وہ اُن کے بارے میں فیصلہ کرے۔ مذہبی اور معاشرتی لعن طعن کو تخلیقی غور و فکر اور ارتقاء کے قدرتی عمل میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔

یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام کو آج ایسے حالات سے سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جو انقلابی تبدیلیوں کے پیدا کردہ ہیں اور یہ کہ پہلے کے حل ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ناکافی ہیں۔ آج پہلی صدی ہجری کی طرح مسلمانوں کو نظریاتی تشکیل کے عمل کو پھر دُہرانا ہوگا تاکہ بنیادی طور پر مختلف معاشرتی نظام میں جو نئے سوال پیدا ہو رہے ہیں، ان کے اسلامی جواب پوری طرح دیئے جائیں۔ اور تو اور مغرب کو ابھی صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والی الجھنوں پر قابو پانا ہے۔ یہ خود اپنی ذات کی طرف ہمہ تن متوجّہ دوسروں سے الگ تھلگ ان عظیم چیلنجوں سے نبرد آزما افراد ہی ہیں، جو جدید بھول بھلیوں سے باہر نکلنے کی راہ پا سکتے ہیں۔ خود معاشرے کا اس میں فائدہ ہے کہ وہ ایسے افراد کے معاملے میں فیاضی برتے۔ غرض معاشرتی زندگی کی تنظیم وسیع بنیادوں پر ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں ایک اچھی خاصی تعداد میں ایسے غیر مذہبی (سیکولر) ادارے قائم کئے جائیں جن میں یہ افراد مختلف امور کے متعلق بشمول سیاسیات برابر اظہار ذات کرتے رہیں۔ یہ اظہار ذات کی مقدّس روایت ہے، جو معاشرے کے لئے سب سے بڑھ کر اہم ہے اور جسے ہر حال میں باقی رکھنا چاہیئے۔ یہ اختلافات کو رفع کرتی، آراء کو یقینیات اور بعد میں پختہ عقیدے میں بدلتی ہے۔

ترکوں کا طریقہ سترھویں صدی کے شروع میں فلانڈرس کے ایک سیاسی مدبّر لبسبق نے کہا تھا: "ترکوں کا ہمیشہ یہ طریقہ ہے کہ جب کبھی اُن کے ہاتھ کوئی غیر معمولی خوبیوں کا آدمی آجاتا ہے، تو خوشی مناتے ہیں اور اس طرح مسرور ہوتے ہیں، جیسے اُن کو بیش قیمت موتی مل گیا۔ اس آدمی میں جو بھی صلاحیتیں ہوتی ہیں، انہیں بروئے کار لانے میں، وہ محنت اور سوچ بچار جو کچھ بھی کر سکتی ہے، اس سے پورا پورا کام لیتے ہیں اور اس بارے میں کوئی کوشش اُٹھا نہیں رکھتے۔" [19] مسلمانوں کو چاہیئے کہ ترکوں کے اس اچھے طریقۂ عمل کو زندہ کریں۔ یہ یقیناً ایک غیر معمولی آدمی ہی ہوتا ہے جو مختلف حالات میں ہونے والے واقعات کے اندر سے جھانک سکتا اور اُن سے عالمی اور ہمہ گیر اصول اخذ کر سکتا ہے۔ اس قسم کے آدمی کو کھونا یا اس کی ہمّت توڑنا یقینی طور پر ایک معاشرتی جرم ہے۔

افکار و خیالات معاشروں کی روح رواں ہوتے ہیں۔ ایک مفید خیال کے ساتھ درجنوں ایسے خیالات بھی ہو سکتے ہیں جو بے کار بلکہ نقصان دہ بھی ہوں۔ معاشرے کو بہر حال اپنے اندر اتنی سمجھ پیدا کرنی چاہیئے کہ وہ مفید اور غیر مفید و نقصان دہ خیال میں تمیز اور آخر الذکر کی مزاحمت کر سکے۔ غیر مفید افکار و خیالات مسترد کرتے ہوئے

---

[19] آرنلڈ ٹائن بی کی کتاب "A STUDY OF HISTORY" میں جلد ۳ صـ ۴۲

معاشرے کو تخلیقی غور و فکر جیسی نادر چیز ختم نہیں کر دینی چاہیئے۔ اس کے برخلاف معاشرے کو خود اپنی ذات کی طرف ہمہ تن متوجہ فرد کی سرپرستی کرنی چاہیئے جو فرسودہ خیالات کے سامنے دبنے سے انکار اور اپنے طور سے نئے سرے سے سوچنے پر اصرار کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد نئے گرد و پیش میں زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف کریں اور کردار اور اخلاقی قدروں کے نئے معیاروں کو جنم دیں۔

آزاد خیالی کی ضرورت اب بقا کی امید اس میں ہے کہ اس طریقہ کار کو بدل دیا جائے جو تعصب اور کٹر راسخ العقیدگی کو وجود میں لانے کا موجب بنا ہے اور اس میں پہل صرف قابل افراد ہی کر سکتے ہیں۔ مجموعی کٹر پن اور سختی کی جگہ آزاد خیالی آنی چاہیئے تاکہ انفرادیت نشو و نما پا سکے۔ ایک فرد کا خود اپنے لئے سوچنے کا حق ہر حال میں محفوظ رہنا چاہیئے۔ اگرچہ یہ بُری مثال ہے لیکن ابو العلاء معری کی قرآن کے مقابلے میں تصنیف پیش کرنے کی کوشش اس وسعت مشربی کی طرف ضرور اشارہ کرتی ہے جو ایک زمانے میں مسلم معاشرہ افراد کی انوکھی حرکات کے بارے میں روا رکھتا تھا، اپنی اس گھٹیا کتاب کی مدافعت میں اس نے کہا تھا کہ اس کی کمتری محض اس لئے ہے کہ اسے ابھی چار صدیوں تک پڑھنے والوں کی زبانوں نے صاف و رواں نہیں کیا۔ ابو العلاء معری کی بعض دوسری کتابیں ہیں، جن میں مروجہ عقائد کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اُس زمانے میں ایسی چیزیں اس لئے برداشت کی جاتی تھیں کہ مسلمانوں کو خود اپنے اوپر اعتماد تھا اور اُن میں اتنی عظمت تھی کہ وہ ایسی چیزوں سے پریشان نہیں ہوتے تھے۔ ان سے کہیں زیادہ چھوٹی چیزوں کے معاملے میں مسلمانوں کی موجودہ زود حسی ان کے چھوٹے پن کی وجہ سے ہے۔ قافلے کو بھونکتے ہوئے کتوں سے آخر پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ موجودہ تنگ دلی کی جگہ آزاد خیالی اور دماغ اور نظر کی وسعت کو لینی چاہیئے تاکہ تخلیقی غور و فکر پھل پھول سکے۔

حکومت مشورے سے ہو ایک لحاظ سے سیاست عملی تطبیق ہے روزمرہ کی زندگی پر نظریۂ حیات کی عہد گزشتہ میں بے لوچ سیاسی طرز عمل نے اسلام کے قالب کو سخت بنا دیا تھا، جس کا نتیجہ آخر میں اندھا دھند تعصّب کی صورت میں نکلا۔ آپس کے اختلافات تلوار کے ذریعہ یا مذہبی و روحانی لعن طعن سے رفع کئے گئے۔ فرقہ پرستی نے امت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور تعصّب اس کی تباہی کا باعث بنا۔ بڑے معاشروں کے اختلافات کو اگر زبردستی دبایا جائے تو ان کا شیرازہ بکھرے بغیر نہیں رہتا۔ ان اختلافات کو باہم بحث و گفتگو سے دُور کرنے اور اُمت کے وسیع تر مفادات کے پیش نظر مفاہمت کرانے کی کوئی راہ ڈھونڈنی ہوگی۔

اس سلسلے میں قرآن نے یہ طریقہ کار تجویز کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

ولتکن منکم اُمّۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر

واولئك هم المفلحون ولا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءهم البينٰت واولئك لهم عذاب عظيم۔ (اور تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہیئے۔ وہ نیکی کی دعوت دیں۔ اچھے کاموں کا حکم کریں۔ بُرے کاموں سے منع کریں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جن میں تفرقہ پیدا ہو گیا اور ان کے پاس نشانیاں آنے کے بعد ان میں اختلاف ہوا، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔) ۳ : ۱۰۴ - ۱۰۵ -

نیز ارشاد ہے :

كنتم خير امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله..... (تم بہترین اُمت ہو، جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو) ۳ : ۱۱۰

ایک اور مقام پر قرآن رسول اللہ صلعم کو یوں مخاطب کرتا ہے : و شاورهم في الامر۔ (ان سے امور میں مشورہ لو)۔ ۳ : ۱۵۹ -

غرض قرآن نے واضح طور پر ایک راہ بتا دی ہے اور وہ یہ کہ جماعتیں منظم ہوں، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں۔ اس کے لئے انہیں لازماً وہ مسائل جو اُمت کو درپیش ہیں، ان کی وضاحت کرنا ہوگی۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ ایک معاشرتی ماحول میں افراد کا جو طرزِ عمل ہوتا ہے، اس سے ہی اُن کا معاشرتی رویّہ بنتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ منظم جماعتیں مسلمان عوام میں مسائل کے بارے میں بحث و مباحثہ کریں تاکہ وہ صورت حال کو سمجھیں اور صحیح چیزوں کو قبول کریں۔ کیونکہ لوگ چھاپہ ماروں کی حیثیت میں صرف اُسی صورت میں لڑ سکتے ہیں جب اُمورِ مملکت سے ان کی انا براہِ راست وابستہ ہو۔ جہاں تک انتخابات کا تعلق ہے، وہ تو آراء کے اظہار کا ایک ذریعہ فراہم کرتے ہیں لیکن آراء مختلف مسائل کے بارے میں باہم صلاح و مشورہ اور بحث و مباحثہ کی بنیاد پر بنتی ہیں۔

مناسب محرک | سیاسیات کا تعلق اقتدار سے ہوتا ہے۔ جو بڑی آسانی سے بگاڑ دیتا ہے۔ اس لئے اقتدار کے علاوہ دوسرے ذرائع کی ضرورت ہے، جن سے صلاح و مشورہ اور بحث و مباحثہ کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ تعلیمی نظام کو غور و فکر کی عادت ڈالنے میں جو آسانی سے اچھے کام اور اسی طرح بُرے کام کی بھی نشان دہی کر سکتی ہے، مدد کرنی چاہیئے اس ضمن میں اخبارات اور عوام تک پہنچنے کے دوسرے وسائل بھی مدد دے سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور طریقے بھی جو براہ راست نظریۂ حیات پر مبنی ہوں، تلاش کرنے چاہئیں تاکہ لوگوں کو بحث و مباحثہ میں شریک ہونے سے ایک مناسب محرک ملے۔ دراصل یہ محرکات ہی ہوتے ہیں جو افراد اور معاشروں کے سب سے فعال عنصر بنتے ہیں، اس لئے ہر طریقے سے خواہ وہ مذہبی

ہو یا غیر مذہبی (سیکولر) ان محرکات کو جاگزیں کرنے میں کام لینا چاہئے تاکہ وہ مناسب وقت پر صالح پھل دے سکیں اور یہ مقصد صرف صلاح و مشور: اور بحث و مباحثہ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

آراء کی تشکیل | یہ جاننا بے حد اہم ہے کہ رائے بحث و مباحثہ کے نتیجے ہی کے طور پر بنتی ہے اور اسے کبھی اوپر سے ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ معتزلہ کی مخالفت میں عالمی اصولوں کی بنیاد پر سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کے جو طریقہ ہائے عمل تھے، وہ بھی مسترد کر دیئے گئے۔ اس فاش غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اشعریوں نے ذہنی تجسّس کو قریب قریب ممنوع قرار دے دیا اور اس طرح زندہ عقیدے کی یہ حالت کر دی کہ وہ چند مخصوص قاعدوں کو اندھا دھند مان لینا بن کر رہ گیا۔ ان حالات میں یقین و اذعان کی جگہ پیروی نے لے لی اور اس طرح اخلاقی حِسّ اور ملّت کی حیثیت کمزور پڑ گئی۔ پھر جلد ہی وہ رَو جو مسلمانوں کو آگے لے جا رہی تھی، پیچھے ہٹنے لگی اور اب تو اُن کی زندگیوں کا سارا سفر لَے دَے کے بس اتنا رہ گیا ہے کہ وہ "دلدلوں اور مصیبتوں میں گرے رہیں"۔

اشعری کی پہنچ اسلام کی روح سے بمشکل ہم آہنگ کہی جا سکتی ہے۔ اجتہاد، اختلاف اور اجماع ایک ہی عمل تفکّر کے پہلو ہیں۔ اجتہاد کی حاجت صرف اس وقت پڑتی ہے، جب کوئی ایسی ضرورت پیش آئے جو پہلے سے موجود سوالات کے ذخیرے سے پوری نہ ہو، اس کے جواب کے لئے تخلیقی فکر یعنی اجتہاد کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اب اجماع کے حصول کے لئے وضاحت کرنا ہوگی اور اس کے لئے بحث و مباحثہ ضروری ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کو سوالات پوچھنے کا حق ہے اور ان سوالات کے جو جوابات دیئے جائیں گے، وہ انہیں قبول اور مسترد کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک زندہ اسلامی معاشرے میں نئے مسائل دریافت کرنے، اُن کے جوابات معلوم کرنے اور اُن پر اس وقت تک بحث و مباحثہ کرنے کا عمل جب تک کہ انہیں اکثریت کی رضامندی حاصل نہ ہو جائے، برابر جاری رہے گا، اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ مذہبی اُمور میں یہ عمل کبھی بلا کیف کے رویّے میں منتج نہیں ہوگا اور سیاسی میدان میں اس کا نتیجہ لوگوں سے صلاح و مشورہ کر کے حکومت کی جائے، نکلے گا۔

شکوک کو دُور کرنا | چھاپہ مار لڑائی کی کامیابی کے لئے اس طرح سوال جواب اور بحث و مباحثہ کرنے کا عمل بے حد اہم ہے۔ اسی لئے کمیونسٹوں کے ہاں ہمیشہ فوجی دستوں کے ساتھ سیاسی افسر متعیّن ہوتے ہیں۔ پارٹی (یعنی چینی کمیونسٹ پارٹی) اور مسلح افواج اتنی زیادہ باہم مربوط ہیں کہ اُن کے درمیان ٹکراؤ کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔[۲۰] فی الحقیقت کمیونسٹ ادب بتاتا ہے کہ سپاہی سیاسی افسروں کی طرف یوں دیکھتے ہیں، جیسے ایک بیمار ڈاکٹر کی

---

[۲۰] کاہین، جی۔ ایم ——— MAJOR GOVERNMENTS OF ASIA P. 104

طرف دیکھتا ہے۔ سیاسی افسر سپاہیوں کو ان سیاسی مسائل سے باخبر رکھتے ہیں، جن سے اُن کو سابقہ پڑتا ہے۔ اسی طرح وہ سپاہیوں کو ایسی توضیحات بھی دیتے ہیں، جن کی کہ سپاہی ضرورت محسوس کریں۔ اس قسم کا طرز عمل تضادات کو رفع کرتا ہے اور افراد کے اناؤں کو پیش نظر مقصد سے متعلق کر دیتا ہے۔ یہی تعلق ہوتا ہے، جو افراد کو اپنا تھوڑا بہت یا سب کچھ ایک مقصد کے لئے خطرے میں ڈال دینے کے قابل بنا دیتا ہے۔ مناسب مدّت میں یہ رائیں یقینیات کی شکل میں پختہ ہو جاتی ہیں اور اس طرح مسلمانوں کو "خیر اُمّة" اور "واعتصموا بحبل اللّٰہ" کا مصداق بنا دیتی ہیں۔ اس داخلی سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کے عمل کے بغیر نہ تو یقین کلّی حاصل ہوتا ہے اور نہ پکا عقیدہ بنتا ہے۔ چنانچہ ایک فرد اذعان و یقین کے بغیر نہ "خیر اُمّة" سے کبھی تعلق رکھ سکتا ہے اور نہ وہ کسی مقصد کے لئے قربانی دے سکتا ہے۔ اس کا وجود اسلام کے لئے بے کار ہے۔

سیاسی سرگرمی خود اپنا تجزیہ کرنے کا عمل برابر جاری رہنا چاہیئے اور تمام شعبوں میں اس کا اطلاق ہونا چاہیئے۔ سیاسی سرگرمی کا نظریۂ حیات یعنی قرآن و سنت اور قومی اجماع (یعنی دستور مملکت) کے تحت ہونا لازمی ہے۔ ان دو چٹانوں کی بنیاد پر اُمت کی وسیع تر وفاداریوں کی تعمیر ہونی چاہیئے۔ موجودہ سیاق و سباق میں سیاسی پارٹیاں وہ جماعتیں ہیں، جو "معروف" کا حکم دیتی اور "منکر" سے منع کرتی ہیں۔ پارلیمنٹ اجتماع کے لئے ایک مقام فراہم کرتی ہے جہاں "شاورھم فی الامر" پر عمل ہوتا ہے۔ ارکان وولٹوں کی اکثریت حاصل کر کے پارلیمنٹ میں جاتے ہیں۔ اور یہ اکثریت پارٹی ہوتی ہے جو قانون منظور کراتی ہے۔ اُمت کی اکثریت کبھی باطل پر اکٹھی نہیں ہو سکتی چنانچہ اختلافات کے اظہار کرنے اور ان پر بحث کرنے، اجتہاد کرنے اور اجماع حاصل کرنے کے لئے پارلیمنٹ ہی بہترین جگہ ہے۔ جب یہ مراحل عمل مکمل ہو جائیں تو پھر مسلمانوں میں تفرقہ نہیں ہونا چاہیئے۔

اگر عوامی امور کے بارے میں آزادانہ اظہار رائے نہ ہو، تو عوامی ادارے ختم ہو جاتے ہیں۔ جب یہ حالت ہو تو صرف چند اشخاص ہی قومی امور کا انتظام کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی رائیں اور خود اپنے آپ کو بھی لوگوں پہ ٹھونستے ہیں۔ یہ صورت حال بآسانی منتج ہوتی ہے عوامی زندگی کو وحشیانہ بنانے بلکہ قتلوں میں۔ بدقسمتی سے موجودہ اسلامی دنیا پر یہی صادق آتا ہے۔ اگر ایک دفعہ وسیع تر وفاداری پیدا ہو جائے، تو ایسی چیزیں نہیں ہو سکتیں۔ لوگ مسائل کو پہچاننا سیکھ جاتے ہیں۔ وہ صحیح مقاصد کی تائید کرتے ہیں اور بُری باتوں کو روکتے ہیں۔ چنانچہ سیاسی سرگرمی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو حالات و واقعات سے باخبر رکھے اور اُن کا مقابلہ کرنے کا انہیں عزم دے، اگر قرآن کا بتایا ہوا طریقہ کار اختیار کیا جائے تو چیزیں اس حد تک نہیں بگڑیں گی کہ تلوار کے استعمال کی ضرورت پڑے۔

سیاسی ابن الوقتی صرف اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب لوگ سوچنا، بحث کرنا اور استدلال کرنا بند کر دیں۔ اس حالت میں وہ آراء اور اعتقادات پر نظرثانی کرنا اور ان کو نافذ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ مسائل سے بے تعلق ہونے کی بناء پر اُن کے دلوں میں اجماع کی، جس کا اظہار قومی اسمبلیوں کے ذریعہ ہوتا ہے، کوئی عزت نہیں رہتی۔ وہ سیاسی ابن الوقتی اور تخریب پسندی کو پہچان نہیں پاتے، اس لئے ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قرآنی حکم کی رُو سے ملّت کو دنیا کا اور خود اپنا تجزیہ کرنے کے عمل کو مسلسل جاری رکھنے کے لئے لازماً طریقے اختیار کرنا چاہیئے اور اس طرح ایک باخبر رائے عامہ کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ صرف ایسے ہی باخبر لوگ نظریۂ حیات اور پاکستان کے مقصد کے لئے لڑ سکتے ہیں۔ لازماً اس کے یہ معنی ہوں گے کہ نظریۂ حیات اور اُمت کی عالمی ماحول اور عالمی طاقتوں سے خود بخود ہم آہنگی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس طرح اسلام کی تاریخی اشکال برابر ارتقاء پذیر رہیں گی اور وہ سدا جدید رہے گا۔

صنعتی معاشرہ اسلام کو اُن زائد چیزوں سے جو دوران تاریخ اس میں شامل کر دی گئی ہیں، نیز اس کی غلط تعبیرات سے پاک صاف کرنے کے علاوہ مسلمانوں کو صنعتی نظام سے پیدا ہونے والے چیلنج کا بھی سامنا کرنا ہے۔ اس نظام کی سب سے بڑی کنجی مشین ہے۔ "مشین الف لیلہ کے جن کی طرح ہے۔ اپنے مالک کے لئے خوب صورت اور کارآمد اور اس کے دشمنوں کے لئے ڈراؤنا اور ہیبت ناک۔"[۲۱] اس وقت مسلمانوں کا شمار قریب قریب اس جن کے مالک کے دشمنوں میں ہوتا ہے۔ بہرحال اب وہ مشین کا استعمال سیکھ رہے ہیں۔ بے شک مشین طبعی ضرورتیں پورا کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانی جذبات کو بھوکا رکھتی ہے۔ وہ مسرّت کے اہم اجزا فطری آمد اور رنگا رنگی کو ختم کر دیتی ہے۔ انسانی جبلت جو شکست کھانے سے انکار کرتی ہے، اس نے مشینی زندگی کی غلامی کے خلاف بغاوت کر رکھی ہے۔ مغرب میں ایک عام بغاوت ہے۔ جب تک انسانیت کے علوم ترقی کر کے طبعی سائنسوں کے ہم پایہ نہیں ہو جاتے، انسان کا مقدر مکمل تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ یہ یقیناً بڑا ہولناک یوم الحساب ہے۔

گروہ کا آدمی صنعتی معاشرہ نے بہرحال اپنی قدریں مستحکم کر لی ہیں جو زرعی معاشرے کی قدروں سے نمایاں طور پر الگ ہیں۔ صنعتی معاشرہ انفرادیت کو ختم کر دیتا ہے اور بڑے شہروں میں رہنے والے افراد اس میں اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اکتاہٹ پیدا کرتا ہے، جس پر قابو پانے کے لئے انسانی احتیاجات بڑھتی جاتی ہیں۔ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ ہے۔ اس کا نتیجہ انسان کی ایک نئی صنف یعنی گروہ کا آدمی کی صورت میں نکلا ہے۔[۲۲] یہ

---

[۲۱] رسل برٹرینڈ SCEPTICAL ESSAYS ص ۵۷

[۲۲] دیکھئے اورتگا۔ وائی۔ گیسٹ کی کتاب THE REVOLT OF THE MASSES.

آدمی اُس ہم رنگی و یکسانی کو جو مشین نے اُس کی زندگی پر مسلط کر دی ہے، ہر ممکن طریقے سے توڑنا چاہتا ہے۔ اس میں وہ کسی اخلاق یا کسی اور ذمہ داری کی جو معاشرتی یا ثقافتی قدروں سے پیدا ہوتی ہے، پروا نہیں کرتا۔ وہ مادیت پسند اور لذت پسند ہے۔ جمہوریت نے اس گروہ کے آدمی کو عالمی امور کی باگ ڈور سپرد کر دی ہے۔ فلاحی مملکت کے تصوّر کا مقصود در حقیقت اسی کو خوش کرنا ہے۔

غرض یہ ہیں وہ افراد جن سے صنعتی معاشرے ترکیب پاتے ہیں! لیکن پاکستان صنعتی انقلاب کی معیشت سے الگ بھی نہیں رہ سکتا۔ "پس ماندہ اقوام کے لئے ضروری ہے کہ اگر انہیں باقی رہنا ہے تو اس نئی معیشت میں داخل ہوں اور اسے اختیار کر کے ہی وہ مفتوح ہونے یا معاشی اور ثقافتی طور پر مدغم ہونے سے بچ سکتے ہیں"[۲۳]۔ ان خطرات سے بچانے کے علاوہ یہ صنعتی نظام ہی ہے جو احتیاج و محرومی کی بہت بڑی لعنت کو ختم کرنے کا امکان پیش کرتا ہے! افلاس و غربت کی ذمہ داری بالکل جماعت پر ہوتی ہے اور صرف جماعت پر۔ اور اس کی وجہ تمام تر منصوبہ بندی اور قدرتی وسائل سے استفادہ نہ کرنا ہے۔ پروفیسر جے۔ کے گلبرتھ نے معاشی لحاظ سے افلاس کو فی الحقیقت ایک شرمناک چیز بتایا ہے[۲۴]

معاشرتی تبدیلی اب منصوبہ بندی اور قدرتی وسائل کا استحصال معاشرتی تبدیلی کے مسائل پیدا کرتا ہے۔ یونیسکو کے ایک مطالعہ نے بتایا ہے کہ جب تبدیلی سے ظہور میں آنے والے تناؤ شدید صورت اختیار کرتے ہیں تو اُن سے پانچ بڑے ردّ عمل ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ لوگ اپنے پہلے طرز عمل کی طرف لوٹیں گے جو نئے علم کی وجہ سے اور بھی کم اطمینان بخش معلوم ہوں گے۔ دوسرا ردّ عمل یہ ہوگا کہ لوگوں کے رویّے میں پختگی کم اور طفلانہ پن اور غیر ذمہ داری زیادہ ہوگی۔ تیسرا یہ کہ مایوسی اور بدلے ہوئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی مشکلات سے جو تناؤ جمع ہوگا، وہ اس طرح کے جارحانہ افعال میں اپنی تسکین چاہے گا، جن کا نہ اُس فرد سے یا اس صورت حال سے تعلق ہوگا، جو دراصل اس تناؤ کو پیدا کرنے کی موجب تھی۔ چوتھا ردّ عمل یہ ہوگا کہ فرد اس طرح کی مایوس کن صورت حال سے جسمانی اور نفسیاتی طور پر علیحدگی اختیار کرے۔ یہ علیحدگی یا تو بے حسی کی یا اُس کی متبادل سرگرمیوں کی، جیسے کہ شراب نوشی ہے، صورت اختیار کر لیتی ہے۔[۲۵]

لیبان کا نظریہ گروہ انسانی یہ پہلے کے طرز ہائے عمل کی طرف مراجعت، طفلانہ پن اور غیر ذمہ داری، جارحیت، شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈنا اور مسلسل قسمت کا رونا روتے رہنا، یہ سب آگے چل کر جماعتی بیماری بن جاتی ہے۔

---

[۲۳] لپ مین والٹر THE GOOD SOCIETY صـ ۲۰۶

[۲۴] CULTURAL PATTERNS AND TECHNICAL CHANGE دیکھئے میڈ مارگیرٹ (ایڈیٹر)

[۲۵] THE AFFLNENT SOCIETY صـ ۳۳۳

اگر اس کا مناسب علاج نہ ہو، تو اس سے تھکے ہارے لوگوں کی بعینہٖ لیبان کے انسانی گروہوں کی حالت ہو جائے گی۔ آدمی انفرادی طور پر اور بحیثیت ان مخصوص گروہوں کے ارکان کے، دو مختلف نوع ہو جاتے ہیں۔ موقع پرست مذہب کے نام سے سیاست کرنے والے سیاست دانوں کے ہاتھوں میں یہ بارود کا پیپا ثابت ہو سکتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں لاہور میں جو ہنگامے اور فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، وہ اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس طرح کے گروہوں کا رویّہ کتنا تباہ کن ہو سکتا ہے۔

لیبان نے اس طرح کے گروہوں کی نفسیات بڑی عمدگی سے بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "گروہ اتنے زیادہ بے چین اور متلون طبیعت کے ہوتے ہیں کہ ان کا اخلاق پسند ہونا مشکل ہے"[۲۶] "ایک گروہ بڑی آسانی سے جلّاد کا کردار ادا کر سکتا ہے، اور اتنی ہی آسانی سے وہ شہید کا کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔"[۲۷] "گروہوں میں ناقابل تسخیر حد تک قدامت پسندانہ جبلتیں ہوتی ہیں، جیسی کہ وحشیوں میں۔ وہ روایات کا ایک پجاری کی طرح احترام کرتے ہیں۔ اُن کے اندر ہر نئی چیز سے، جو اُن کی زندگی کے مخصوص حالات کو تبدیل کرنے کے قابل ہو، ایک غیر شعوری دہشت راسخ ہوتی ہے۔"[۲۸] "گروہوں کو کسی اور چیز سے پہلے ایک دیوتا کی ضرورت ہوتی ہے۔"[۲۹]

ایک بڑا چیلنج اسلام کو اس سے قبل کبھی اتنے بڑے معاشرتی اور سیاسی چیلنجوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شروع کے زمانوں میں اس کے پاس اقتدار کے ذرائع تھے اور وہ جیسا چاہتا، دنیا کو چلا سکتا تھا۔ اپنے مسائل کو حل نہ کر سکنے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئیں، اُن کی وجہ سے کوئی بہت بڑی تباہیاں نہیں آئیں۔ اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کمزور ہے۔ کہیں بھی کوئی تخلیقی عمل کی شعاع نہیں اور اسلام قریب قریب منجمد ہو گیا ہے۔ اُس کے غصے میں بھرے ہوئے مخالف اس پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اور اُس کا پیچھا کر رہے ہیں اور وہ اسے اس کا کوئی موقع نہیں دیں گے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے۔

یہ حالات ہیں، جن کے اسلام کو حل پیش کرنے ہیں۔ محض ماضی کی باتیں کرنے سے کام نہیں ہوگا۔ اس سے تو مزید الجھنیں پیدا ہوں گی۔ یہی وہ روش تھی، جس نے ملت کو مجبور کیا کہ وہ علماء کو نظر انداز کر دے۔ مثال کے طور پر ملّت نے یورپی تعلیم، یہاں تک کہ کافی اور تمباکو کے استعمال کے معاملے میں علماء کے فتوے کی پروا نہ کی۔ اسلام کو بہت جلد صنعتی انقلاب سے پیدا ہونے والے یعنی گروہ کے آدمی کے لئے ایک ضابطہ تشکیل کرنا ہوگا۔ اس آدمی کے لئے چیزوں کی ایک عقلی و منطقی بنیاد مہیّا کرنا ہوگی، جس سے اُس کے تجربات و افکار اور اس کی قدریں مربوط ہو سکیں۔ صرف مذمت کرنے سے کچھ

۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ گستاف لی بان THE CROWD

حاصل نہیں ہوگا۔ علماء کی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ وہ پھر نظر انداز نہ کئے جائیں۔ اور اس کی صرف یہی صورت ہے، کہ جماعت جن الجھنوں میں گرفتار ہے، اُن کو سمجھا جائے۔ اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو پھر پوری تباہی ہے۔ صنعتیں جس طرح کے انسانی گروہوں کی تخلیق کر رہی ہیں، وہ ان تمام چیزوں کو جنہیں علماء بڑا عزیز رکھتے ہیں، تباہ و برباد کر سکتے ہیں۔ کوئی بیچ کی راہ ضرور نکالنی چاہیئے تاکہ لوگ فعّال و خلّاق قسم کی مربوط جماعت بن سکیں۔

اس مرحلے پر یہ نہایت ضروری ہے کہ موجودہ اور مستقبل کے حالات کا ایک وسیع تر جائزہ لیا جائے۔ مغرب کی حسّی ثقافت ایک بحران سے دوچار ہے۔ یہ کلچر نمایاں اور مستقل طور پر افادیت پسندانہ اور لذت پرستانہ ہے۔ انیسویں صدی ہی میں اس میں ایک مذہبی روگ سرایت کر گیا تھا۔ دو عالمی جنگوں نے اس کی حالت اور بھی بگاڑ دی ہے۔ بس ایک عام گھبراہٹ کا احساس ہے۔

سر جیمز فریزر نے "مغرب میں مشرقی مذاہب" پر بحث کرتے ہوئے ۱۹۲۲ء میں یہ رائے دی تھی:- "اپنی اور دوسروں کی روحوں کو بچانے کے لئے انھوں نے اس پر قناعت کر لی کہ وہ مادی دنیا سے دست کش ہو جائیں۔ اسے انھوں نے بدی پر محمول کیا اور اس کو تباہ ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ ان کا دل میں جما ہوا یہ خیال ایک ہزار سال تک رہا۔ قرونِ وسطیٰ کے خاتمے پر جب رومی قانون، ارسطاطالیسی فلسفہ اور قدیم آرٹ و ادب کا احیاء ہوا تو پھر کہیں یورپ کی زندگی اور کردار کے بارے میں اپنے اصلی مثالی معیاروں اور دنیا کے متعلق زیادہ معقول اور زیادہ مردانگی کے تصورات کی طرف واپسی ہوتی ہے۔ تہذیب کی رفتار ترقی میں ایک طویل وقفہ ختم ہوتا ہے۔ مشرق کی طرف سے جو حملہ ہوا تھا، اس کی چڑھی ہوئی رَو واپس پلٹتی ہے اور اب تک وہ اُتر رہی ہے۔" ۳۰؎

مشرقی مذہب اور اس کی قدروں کی رَو کے اس طرح اُترنے سے مغرب میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ ایٹمی اسلحہ نے مغربی تہذیب کی ہولناک فطرت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ بے شک یہ اسلحہ دشمن کا صفایا کر سکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انسانیت کو بھی مٹ جانے کا خطرہ درپیش ہے۔ مغرب اس مقام پر پہنچ گیا ہے، جس کے آگے راستہ بند ہے۔ اس احساس نے مغرب کو آمادہ کر دیا ہے کہ وہ اُن اصولِ اخلاق پر تنقید کرے، جن کی ترکیب بہت سے اجزاء سے ہوئی ہے۔ وہاں ایک عینی ثقافت یعنی ایک نئے مذہب کی جستجو ہے۔" یورپ اور امریکہ میں مذہبی تحریکوں کی بھرمار ہے جو مختلف درجوں میں حد سے بڑھی ہوئی غلط بیانیوں کی شکار ہیں، اور یہ تحریکیں صرف اپنی مخصوص غلط بیانیوں ہی کی نہیں، بلکہ عام معنوں میں مذہب کے بھی مسخ شدہ تصوّرات کی اشاعت کرتی ہیں۔ نظری اور عملی ہر دو اعتبار سے ان

۳۰؎ - صہ ۱۵ء GOLDEN BOUGH

گھروندوں کی صفائی کی ضرورت ہے جس کے بعد ہی کوئی ترقی ہو سکتی ہے۔"[۳۱]

وہ تصورات جن سے انسان کی تکمیل ہو سکے، ان کی تلاش شروع ہے۔" تہذیب کی خصوصی ماہیت، اس کی مادی کامیابیوں میں منحصر نہیں، بلکہ اس حقیقت میں ہے کہ افراد انسان کی تکمیل کرنے والے اور لوگوں اور مجموعی طور پر پوری انسانیت کے معاشرتی اور سیاسی حالات کو بہتر بنانے والے مثالی معیاروں کو ذہن میں رکھیں۔ اور غور و فکر کی اس عادت کی تعیین اس سے ہوتی ہے کہ ان مثالی معیاروں کے مطابق زندگی بسر ہو، اور وہ برابر اثر انداز ہوتے رہیں۔"[۳۲] مغرب کے غور و فکر کی یہ بڑھتی ہوئی عادت مختلف طریقوں اور خاص کر اقوام متحدہ میں اپنے اظہار کے لئے راہ ڈھونڈھ رہی ہے۔

اسلام کا عالمی کردار اس وقت تو افکار و خیالات کی جنگ زوروں پر ہے۔ کئی ایک طریقوں سے نظریاتی کانٹ چھانٹ جاری ہے۔ مسلمانوں میں تو یہ کانٹ چھانٹ بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اصول نمو پذیر معاشرے کے لئے ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔" ایسے زبردست دباؤ موجود ہیں جو آدمیوں کو ایک متحدہ عالمی مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ مختلف مذاہب میں جو چیزیں بھی مثالی قدریں رکھتی ہیں انہیں اس متحدہ عالمی مذہب میں شامل کر لینا چاہیئے ..... مسلمان علماء دینیات کے سامنے اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ اپنے مذہب میں جو چیز وہ قابل قدر سمجھتے ہیں، اسے وہ اس شکل میں پیش کریں کہ وہ دوسروں کے لئے قابل قبول ہو سکے"[۳۳] آرنلڈ ٹائن بی کی رائے میں اسلام نسلی تعصب اور کثرتِ شراب نوشی کے دو نمایاں خطرات کا مقابلہ کر کے ایک بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے:" اگر انسانیت کی موجودہ صورت حال "نسلی جنگ" کو بروئے کار لانے کا باعث بنتی ہے، تو اسلام کو ایک بار پھر اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کے لئے عمل میں لایا جا سکتا ہے"[۳۴] امریکی بلکہ دوسرے یورپی بھی نسلی تعصب کا شکار ہیں۔ سوویت یونین والے کثرت شراب نوشی کی وبا سے محفوظ نہیں۔ لیونڈ الیچیف نے ۱۹۶۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو بتایا تھا کہ سوویت یونین میں دو تہائی سے زیادہ عام مگر سنگین نوعیت کے جرائم اور نصف سے زیادہ خطرناک قسم کے جرائم کا سبب کثرت شراب نوشی ہے۔ کمیونسٹ، سوویت یونین کے ایک عام آدمی کے لئے ایک ضابطہ اخلاق کی تشکیل میں مصروف ہیں۔ ظاہر ہے، اسلام سب کے لئے یہاں تک کہ کمیونسٹوں

---

[۳۱] واٹ۔ ایم۔ منٹگمری ص ۱۷۵ TRUTH IN THE RELIGIOUS

[۳۲] سچوئٹزر۔ البرٹ ص ۱۸۷ CIVILIZATION AND ETHICS

[۳۳] واٹ۔ ڈبلیو منٹگمری ص ۱۷۸ ISLAMIC PHILOSOPHY AND THEOLOGY

[۳۴] اگلے صفحے پر

کے لئے بھی ایک پیغام رکھتا ہے۔

بہرحال اسلام اس نئی تہذیب کے ارتقاء میں ایک بڑا اہم اور مثبت کردار انجام دے سکتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے :۔ "ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ"... (وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے ....) ۹ - ۳۳ مسلمانوں کو اس مقصد خداوندی کا علمبردار بن کر آگے بڑھنا ہے۔ اور وہ حقائق کی موجودہ دنیا سے اپنی آنکھیں بند کر کے ایسا نہیں کر سکیں گے! انہیں موجودہ چیلنجوں کی نشان دہی کرنا اور ان سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ عام ذہنوں میں پرانی قدریں مبہم ہو گئی ہیں۔ اس لئے وہ صحیح نقطہ نظر اور صحیح طرز عمل پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ آج بدلے ہوئے سیاق و سباق میں اخلاقی مسائل ابھر رہے ہیں، اور جوابات کا پہلے جو ذخیرہ ہے، وہ ان کا حل نہیں کر پاتا۔ اسلام کو اپنے تصوراتی نظام میں مشین کو مربوط کرنا ہوگا اور اس کے بارے میں ایسی قدروں کو نئے سرے سے پیش کرنا ہوگا، جو انسانیت کے لئے قابل قبول ہو سکیں، ایسا نہ کرنا اس اعتماد کی خلاف ورزی ہوگی، جس کا اہل اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بنایا ہے

مسلمانوں کی موجودہ صورت حال انتہائی تشویش ناک ہے۔ یہ غیر مسلموں کی آپس کی دشمنیاں ہیں، جو انہیں "ان یطفئوا دین اللہ بافواھھم" (یعنی خدا کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر بجھا دیں ۹ - ۳۲) سے باز رکھ رہی ہیں۔ مسلمان خود کوئی ایسی طاقت نہیں کہ وہ اس میں مانع ہو سکیں۔ "واثاقلتم الی الارض (تم کاہلی کے سبب سے) زمین پر گرے جاتے ہو۔ ۹ : ۳۸) کے بمصداق ہیں۔ وہ مغرب بلکہ کمیونسٹوں کے بھی پیروؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اگر وہ بیدار نہیں ہوتے اور ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انہیں پورا نہیں کرتے، تو ان کا انجام یقیناً حسرت ناک ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔ الا تنفروا یعذبکم عذاباً الیماً ویستبدل قوماً غیرکم ولا تضروہ شیئاً۔ (اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا۔ اور تمہاری جگہ اور لوگ پیدا کر دے گا۔ ۹ : ۳۹)

اگر مسلمان اپنے موجودہ طریقے نہیں بدلتے تو بمصداق "قوماً غیرکم" دوسرے لوگ اس نئی ابھرنے والی مختلف اجزا سے مرکب تہذیب کے سپوت ہوں گے۔

روایت پسند اور جدت پسند خود اسلامی دنیا کے اندر کی موجودہ صورت حال بڑی افسوس ناک ہے۔

---

۳۴ نائن بی۔ آرنلڈ۔ CIVILIZATION ON TRIAL ص ۱۸۷

روایت پسند علماء کے نزدیک کئی صدیاں پہلے اسلامی تخلیقی فکر ایک مقام پر آکر رُک گیا ہے۔ علماء زمانے کے ساتھ چلنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس تمام مدّت میں نہ تو کوئی انقلابات ہوئے ہیں اور نہ اسلام کی نئی تعبیر کی کبھی ضرورت پیدا ہوئی ہے۔ دوسری طرف جدید صاحب علم میں صبر و ضبط نہیں۔ وہ یہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ آخر روایت پسند علماء کا کیا مُوقف ہے۔ چنانچہ ان دو فریقوں میں جو کہ کٹرپن اور آزادئ فکر کے دو نقطہ ہائے نظر کے حامل ہیں، کسی قسم کے باہمی تعاون کا بہت ہی کم امکان ہے۔

ان دونوں فریقوں کی آپس کی کشمکش خطرات سے پُر ہے، اور اس نے تمام ترقی کو مشکل بنا دیا ہے۔ تُرکی کی مثال بتلاتی ہے کہ کس طرح جدت پسندی نے تمام مراعات کے باوجود ایک عظیم قوم کو قریب قریب دو متخاصم گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ قومی وحدت و سالمیت کا تو کوئی بدل نہیں ہوتا، اسے کھو کر جو ترقی ہوگی وہ سرتاپا فریب اور خطرناک ہوگی۔ موجودہ سیاق و سباق میں اس قسم کے افکار کے انتخاب میں مسلمانوں کو اپنا خود ارادیت کا حق استعمال کرنا ہوگا۔ ایک نئے سنی مسلک کو معرض وجود میں آنا ہے جس میں یہ اعتماد اور حوصلہ ہو کہ وہ ہر قسم کے مروجہ خیالات سے نمٹ سکے اور پختہ اور پُر از معلومات فکر کی بنیاد پر انہیں جذب یا اُن کی اصلاح یا اُن کو مسترد کر سکے۔

روایت پسند اور جدت پسند گروہوں کے علماء کو اسلام کی خدمت کے لئے اکٹھا ہونا چاہیئے۔ اُنہیں اپنی کوششوں کو متحد کرنا چاہیئے اور اسلام کی ایک ایسی تاریخی شکل ترتیب دینی چاہیئے جو موجودہ صنعتی معاشرے کے زبردست چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو۔ انہیں یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ اسلامی ورثے میں اصلی و لازمی چیزیں کیا ہیں اور وقتی کیا؟ اور یہ بھی کہ موجودہ تہذیب کے اچھے اور مفید پہلو کون سے ہیں؟ اس کے لئے آزاد خیالی، کشادہ ذہن اور غیر جذباتی اور معروضی مطالعہ و علمی تحقیق کا ذہنی رجحان کی جو کہ تعمیری غور و فکر کے لئے ناگزیر ہوتا ہے، ضرورت ہے۔ حقائق کی موضوعی تعبیر کرنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ مسلمان بہت عرصہ اوہام کی دنیا میں رہ چکے ہیں۔ اس اہم تحقیق میں سخت، مسلسل، تخلیقی اور ایمان دارانہ کام کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔

ایک اعلیٰ فکر کی دریافت پر ہی اس کا انحصار ہے کہ اسلام بڑی سرعت سے منتشر ہونے والے مسلمانوں کے لئے ربط و اتصال بہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح کا فکر فرد اور ملّت دونوں میں یہ جذبہ پیدا کرے گا کہ وہ ایک صحیح مقصد کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اسلام اپنا مذہبی ورثہ اور اپنا مقام حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے کھو دے گا۔ جہاں بصیرت نہ ہو، لوگوں کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔